آپ بیتی ''آئی ایم ملالہ'' میں سیاسی شعور اور مزاحمتی بیانیہ کی پیش کش

Political Consciousness and the Narrative of Resistance in the Autobiography "I Am Malala"

[i] ندا یوسف [ii] ڈاکٹر حافظہ شہلا اقبال [iii] ڈاکٹر سارہ مجید

Abstract:

Malala Yousafzai's autobiography I Am Malala is regarded as a significant political, social, and intellectual document of the contemporary age in which personal experiences transform into collective consciousness. This autobiography is not merely the story of a young girl's struggle for education; rather, it symbolizes resistance against extremism, patriarchy, religious radicalism, and socio-political crises in the Subcontinent, particularly in Pakistan. Through her memories, Malala portrays the Talibanization of Swat, the ban on girls' education, and the atmosphere of fear and oppression in such a powerful manner that individual suffering evolves into collective political awareness. The book presents education not only as a means of learning but also as a pathway to freedom, democracy, human rights, and women's empowerment. Malala's struggle demonstrates that women's autobiographies are not simply narratives of personal lives; they are also effective mediums of political resistance, social awakening, and intellectual formation. I Am Malala is an autobiography that transforms a woman's voice into a part of global human consciousness and inspires future generations with the courage to question, resist, and bring about change.

Keywords: *Women's Autobiography, Malala Yousufzai, Talibanization, Resistance, Women's Education, Human Rights, Political Consciousness.*

ملالہ یوسف زئی کی خود نوشت ''آئی ایم ملالہ'' عصرِ حاضر کی ایک اہم سیاسی، سماجی اور فکری دستاویز ہے جس میں ذاتی تجربات اجتماعی شعور کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ آپ بیتی نہ صرف ایک لڑکی کی تعلیمی جدوجہد کی داستان ہے بلکہ برصغیر خصوصاً پاکستان میں شدت پسندی، پدرسری نظام، مذہبی انتہا پسندی اور ریاستی و سماجی بحرانوں کے خلاف مزاحمت کی علامت بھی ہے۔ ملالہ نے سوات میں طالبانائزیشن، لڑکیوں کی تعلیم پر پابندی، خوف اور جبر کے ماحول کو اپنی یادداشتوں کے ذریعے اس انداز سے پیش کیا ہے کہ فرد کا ذاتی دکھ اجتماعی سیاسی شعور میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کتاب میں تعلیم کو آزادی، جمہوریت، انسانی حقوق اور خواتین کی خود مختاری سے جوڑ کر دیکھا گیا ہے۔ ملالہ کی جدوجہد اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ خواتین کی آپ بیتیاں محض ذاتی زندگی کے بیانات نہیں بلکہ سیاسی مزاحمت، سماجی بیداری اور فکری تشکیل کے مؤثر ذرائع بھی ہیں۔ ''آئی ایم ملالہ'' ایک ایسی خود نوشت ہے جو عورت کی آواز کو عالمی انسانی شعور کا حصہ بناتی ہے اور نئی نسل کو سوال، مزاحمت اور تبدیلی کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔

کلیدی الفاظ: خاتون آپ بیتی نگار، ملالہ یوسف زئی، طالبانائزیشن، مزاحمت، تعلیمِ نسواں، انسانی حقوق، سیاسی شعور۔

ملالہ یوسف زئی عصرِ حاضر کی اُن چند شخصیات میں شمار ہوتی ہیں جنھوں نے کم عمری میں ہی عالمی سطح پر تعلیم، انسانی حقوق اور نسوانی شعور کی علامت بن کر تاریخ میں اپنا نام ثبت کیا۔ وہ محض ایک فرد یا کسی ایک خطے کی نمائندہ نہیں بلکہ دنیا بھر کی اُن بچیوں کی آواز ہیں جنھیں تعلیم، آزادی اور اظہارِ رائے کے بنیادی

[i] اسکالر پی ایچ ڈی، شعبہ اردو، دی ویمن یونی ورسٹی ملتان (Corresponding Author)
[ii] استاد، شعبہ اردو، گورنمنٹ ایسوسی ایٹ کالج فار ویمن، عبدالحکیم
[iii] استاد، شعبہ اردو، دی ویمن یونی ورسٹی ملتان۔

حق سے محروم رکھا جاتا ہے۔ ملالہ کی شخصیت عزم، جرات اور فکری پختگی کا ایسا استعارہ ہے جو جدید دنیا میں اخلاقی قیادت (moral leadership) کی ایک روشن مثال بن چکا ہے۔

ملالہ یوسف زئی ۱۲ جولائی ۱۹۹۷ء کو سوات کے ایک علمی اور تعلیم دوست گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد ضیاء الدین یوسف زئی نے ایک معلم اور سماجی کارکن ہوتے ہوئے ملالہ کی فکری تربیت میں بنیادی کردار ادا کیا۔ یہی تعلیمی ماحول ملالہ کے شعور کی ابتدائی تشکیل کا سبب بنا، جہاں تعلیم کو محض ذاتی کامیابی نہیں بلکہ سماجی تبدیلی کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ کم عمری ہی سے ملالہ نے یہ محسوس کر لیا کہ تعلیم، خاص طور پر لڑکیوں کی تعلیم، محض تعلیمی مسئلہ نہیں بلکہ ایک گہرا سماجی اور سیاسی سوال ہے۔

سوات میں شدت پسندی کے دور میں، جب لڑکیوں کے اسکول بند کیے جا رہے تھے اور خوف کی فضا مسلط تھی، ملالہ نے خاموشی اختیار کرنے کے بجائے قلم اور آواز کا سہارا لیا۔ بی بی سی کے لیے فرضی نام سے لکھی گئی ڈائریاں دراصل ایک کم عمر لڑکی کی فکری بغاوت تھیں، جن میں خوف، امید اور مزاحمت ایک ساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں۔ یہ تحریریں ملالہ کے اس شعور کا ثبوت ہیں جو عمر سے کہیں آگے اور فکر سے کہیں زیادہ بالغ تھا۔

۹ اکتوبر ۲۰۱۲ء کو ملالہ پر ہونے والا قاتلانہ حملہ ایک فرد پر نہیں بلکہ تعلیم، امن اور عورت کی آواز پر حملہ تھا۔ تاہم یہ واقعہ ملالہ کی جدوجہد کا خاتمہ نہیں بلکہ اس کے عالمی سفر کا آغاز ثابت ہوا۔ شدید زخمی حالت سے زندگی کی طرف واپسی نے ملالہ کو مزاحمت اور حوصلے کی عالمی مثال بنا دیا۔ اس واقعے کے بعد ملالہ کی آواز قومی حدود سے نکل کر بین الاقوامی سطح پر گونجنے لگی۔

ملالہ یوسف زئی کی فکری شناخت تعلیم کے حق، خاص طور پر لڑکیوں کی تعلیم کے گرد مرکوز ہے۔ ان کے نزدیک تعلیم محض نصابی علم نہیں بلکہ انسان کو سوال کرنے، فیصلے کرنے اور باوقار زندگی گزارنے کا شعور عطا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تعلیم کو جمہوریت، امن اور سماجی انصاف سے جوڑ کر دیکھتی ہیں۔ ان کا یہ تصور انھیں روایتی سماجی کارکن سے ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔

۲۰۱۴ء میں ملالہ یوسف زئی کو نوبل امن انعام سے نوازا گیا، اور وہ اس اعزاز کو حاصل کرنے والی کم عمر ترین شخصیت بن گئیں۔ یہ اعزاز صرف ملالہ کی ذاتی کامیابی نہیں بلکہ دنیا بھر کی اُن لڑکیوں کی جدوجہد کا اعتراف تھا جو خاموشی کے اندھیروں میں تعلیم کے چراغ جلانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ نوبل انعام کے بعد

بھی ملالہ نے شہرت کو مقصد کے تابع رکھا اور ملالہ فنڈ کے ذریعے تعلیم کے فروغ کے لیے عملی اقدامات جاری رکھے۔

ادبی اور فکری اعتبار سے ملالہ کی خود نوشت I Am Malala ایک اہم سیاسی و سماجی متن کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب میں ذاتی تجربہ اجتماعی شعور میں ڈھل جاتا ہے، جہاں ایک لڑکی کی کہانی دنیا بھر کے محروم طبقات کی آواز بن جاتی ہے۔ ملالہ کی زبان سادہ مگر پُراثر ہے، جس میں معصومیت اور فکری سنجیدگی ایک ساتھ نظر آتی ہے۔

ملالہ یوسف زئی جدید دنیا میں تعلیم، امن اور عورت کے حقِ آواز کی ایک مضبوط علامت ہیں۔ ان کی زندگی اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے کہ علم، حوصلہ اور سچائی مل کر طاقت کے سب سے سخت نظاموں کو بھی چیلنج کر سکتے ہیں۔ ملالہ کی آپ بیتی کا مطالعہ اس لیے بھی ضروری ہے کیوں کہ وہ صرف ایک فرد کا نام ہے بلکہ ایک فکری روایت ہے، جو آنے والی نسلوں کو سوال کرنے، سیکھنے اور بدلنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔

ملالہ یوسف زئی کی خود نوشت I Am Malala اکیسویں صدی کی اُن اہم تصانیف میں شمار ہوتی ہے جنھوں نے نہ صرف عالمی سطح پر لڑکیوں کی تعلیم، انتہا پسندی اور انسانی حقوق کی بحث کو وسیع کیا بلکہ پاکستان کے سماجی و سیاسی منظر نامے پر بھی گہرے سوالات اٹھائے۔ یہ کتاب خود نوشت، بیانیہ تاریخ، ثقافتی مطالعہ اور سیاسی احتجاج چاروں جہتوں میں بیک وقت پڑھی جاتی ہے۔ اس میں فرد اور معاشرے کے درمیان تعلق کو ذاتی تجربے اور اجتماعی شعور کے امتزاج کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

یہ آپ بیتی ملالہ یوسف زئی اور کرسٹینا لیمب نے مل کر تحریر کی ہے۔ اس کا ترجمہ مقبول الٰہی نے کیا ہے، اور اسے مشعل بکس لاہور نے ۲۰۱۳ء میں شائع کیا۔ کتاب کو چھے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

کتاب کا آغاز ملالہ اپنے خاندان، ثقافت، سوات کی وادی اور پشتون روایات کے تعارف سے کرتی ہیں۔ وہ اپنے والد کے اسکول، گھر کے ماحول اور تعلیم کے نظریے کو کتاب کے بنیادی خمیر کے طور پر پیش کرتی ہے۔ زیادہ تر پشتونوں کے لیے جب لڑکی پیدا ہوتی ہے تو یہ بڑا اُداس کرنے والا دن ہوتا ہے، اس لیے جب ملالہ پیدا ہوئی تو اُن کے والدین کو نہ تو کسی نے مبارک باد دی اور نہ ہی خوشی کا اظہار کیا:

> جب میں پیدا ہوئی تو ہمارے گاؤں میں لوگوں نے میری ماں سے باقاعدہ ہمدردی کا اظہار کیا اور کسی شخص نے میرے والد کو مبارک باد نہ دی۔ میں صبح سویرے

اس وقت وارد ہوئی جب شب کا آخری ستارہ ٹمٹما کر بجھ گیا تھا اور صبح صادق کی روشنی پھیل رہی تھی۔ ہم پشتون اسے ایک نیک شگون مانتے ہیں۔[1]

ملالہ کا نام میوند کی ملالئ کے نام پر رکھا گیا جو افغانستان کی سب سے بڑی ہیروئن تھی۔ پشتون بہت تفاخر پسند قبائل پر مشتمل قوم ہے، جو پاکستان اور افغانستان میں تقسیم ہے۔ آج بھی وہ اسی انداز سے رہتے ہیں جس طرح صدیوں سے رہتے آئے ہیں، ان کے ضابطے جسے 'پشتون ولی' کہا جاتا ہے انھیں مجبور کرتے ہیں کہ وہ مہمانوں کے خاطر مدارت کریں۔ اُن کی سب سے اہم قدر ننگ یا غیرت ہے اور جس کا چلے جانا پشتون آدمی کے لیے شرم ساری کا باعث ہے۔ اُن کے ہاں ایک کہاوت ہے کہ عزت کے بغیر دنیا کی کوئی قیمت نہیں۔ جب ملالہ چھوٹی تھیں تو اُن کے والد پشاور کے رحمت شاہ سائل کا لکھا ہوا ایک گیت سنایا کرتے تھے:

ترجمہ: اے میوند کی ملالہ اُٹھ، اپنی موثر آواز کے ذریعے
پختونوں کو غیرت دلاؤ، انھیں یک جہتی کا سباق سکھاؤ
کیوں کہ سرحد کے اس پار (افغانستان میں) بھی میرا خون بہایا جارہا ہے
اور سرحد کے اس جانب (پختون خوا میں) بھی مجھے قتل کیا جارہا ہے[2]

خاندانی پس منظر کے بعد ملالہ یوسف زئی نے جنت نظیر وادی سوات جسے مشرق کا سوئزرلینڈ بھی کہا جاتا ہے، کی تہذیب و ثقافت اور تاریخ کو بیان کیا ہے۔ وادی سوات میں اسلام اُس وقت آیا جب گیارھویں صدی عیسوی میں غزنی کے سلطان محمود نے یہاں پر حملہ کیا۔ قدیم دور میں سوات ایک بدھ مت سلطنت تھی، اسے لیے دریائے سوات کے کناروں کے ساتھ ساتھ ہزاروں بدھ خانقاہیں تھیں، جنھیں آگے چل کر طالبان نے تباہ و برباد کر دیا۔ اُن کا گھر ایک منزلہ اور کنکریٹ کا بنا ہوا تھا جو ہندو کش سلسلے کے سائے میں تھا:

ہماری وادی پھل دار درختوں سے بھری ہوئی ہے۔ وہاں انتہائی میٹھے انجیر، انار، آڑو ہوتے ہیں۔ ہمارے باغ میں انگور، امرود اور لوکاٹ ہیں۔ ہمارے سامنے والے صحن میں آلو بخارے کا پیڑ تھا جو لذیذ ترین پھل دیتا تھا۔ ہمیشہ ہمارے اور پرندوں کے درمیان ان تک پہنچنے کی دوڑ ہوتی تھی۔ پرندے اس درخت کو پسند کرتے تھے، یہاں تک کہ نامانوس پرندے بھی اسی پیڑ پر آتے تھے۔[3]

ان کے آباء و اجداد سولھویں صدی میں کابل سے سوات آئے تھے، ان کا تعلق یوسف زئی قبیلے سے تھا۔ یوسف زئی قبیلے کا کوئی حکمران نہیں تھا، جس کی وجہ سے ان کے درمیان اندرونِ خانہ مسلسل لڑائیاں جاری رہتی تھیں۔ مردوں کے پاس رائفلیں ہوتی تھیں جو ان کی شناخت تھی۔ یہ قبیلہ تمام زمین مردوں میں تقسیم کر دیتا ہے، یہ ایک عجیب نظام تھا جسے "ویش" کہا جاتا تھا۔ اس نظام کے تحت ہر پانچ یا دس سال بعد تمام خاندان گاؤں آپس میں تبدیل کرتے اور نئے گاؤں کی زمین کو دوبارہ مردوں کے درمیان تقسیم کرتے تاکہ ہر شخص کو اچھی زمین اور ساتھ ہی خراب زمین پر کام کرنے کا موقع مل سکے۔ ۱۹۲۶ء میں انگریزوں کی طرف سے سردار میاں گل عبدالودود کو سوات کی ریاست کا سربراہ متعین کیا گیا۔ انھوں نے سوات میں پہلی بار ٹیلی فون کا نظام قائم کیا، پہلا اسکول تعمیر کیا اور "ویش" کے نظام کا خاتمہ کیا:

> میں نے بہت جلدی فیصلہ کر لیا تھا کہ میں اس طرح کی نہیں بنوں گی۔ میرے ابو ہمیشہ کہا کرتے تھے "ملالہ ایک پرندے کی طرح آزاد ہو گی"۔ میں خواب دیکھا کرتی تھی کہ میں سکندر اعظم کی طرح ایلم پہاڑ کی چوٹی پر جاؤں گی جہاں پیٹر ستارے کو چھوؤں گی اور وادی سے بھی آگے جاؤں گی لیکن جب میں اپنے بھائیوں کو چھت پر دوڑتے، پتنگیں اڑاتے اور ایک دوسرے کی پتنگیں کاٹتے دیکھتی تو سوچتی تھی کہ کیا بیٹی بھی کبھی اتنی آزاد ہو سکے گی۔[۴]

اس حصے میں ملالہ اپنے والد کی تعلیم دوستی، شخصیت کے استقلال اور سماجی شعور کو اپنے ہیرو کے طور پر پیش کرتی ہیں۔ والد کی شخصیت، کتاب کی تشکیل اور ملالہ یوسف زئی کی شخصیت میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ پدرسری نظام اور قبائلی روایات سے ہٹ کر بیٹی کو اہمیت دیتے ہیں۔ ابتدائی باب میں ملالہ نے اسکول، بچپن کی معصوم دنیا، علاقائی کھیل، ثقافت، تہذیب، پشتون معاشرے کی خوب صورتی اور روایتی مردانہ سماج دونوں پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔ باب دوم سوات میں طالبانزیشن اور روزمرہ زندگی پر اُن کے اثرات کا جائزہ پیش کرتا ہے۔ یہ آپ بیتی سب سے اہم حصہ ہے جس میں ملالہ نے ۲۰۰۷ء اور ۲۰۰۹ء کے درمیان سوات پر طالبان کے عملی قبضے کو عینی گواہ کے طور پیش کیا ہے۔ اس باب کے مندرجات میں ریڈیو ملا، ٹافیاں ٹینس، گیندیں اور سوات کے بدھا، ذہین کلاس، خونی چوک، گلِ مکئی کی ڈائری، مضحکہ خیز امن، وادی کو چھوڑنا شامل ہیں۔

طالبان جب وادی سوات میں داخل ہوئے تو ملالہ کی عمر ۱۰ سال تھی۔ وہ گروپوں کی شکل میں نمودار ہوتے تھے، چاکووں، کلاشنکوف سے مسلح انھوں نے بالائی سوات پر قبضہ کیا۔ وہ افغان طالبان کی نسبت منفرد تھے، اُن کے سروں پر پگڑیاں تھیں اور اُن کی آنکھوں پر سیاہ چشمے ہوتے تھے:

> یہ عجیب و غریب شکلوں والے لوگ تھے، جن کے لمبے الجھے ہوئے بال تھے اور داڑھیاں تھیں اور ان کی شلوار قمیض کے اوپر واسکٹ تھی۔ ان کی شلواریں ٹخنوں سے اوپر ہوتی تھیں۔ ان کے پاؤں میں یا تو جوگنگ والے جوتے یا گھٹیا پلاسٹک کے سینڈل ہوتے تھے اور بعض اوقات ان کے سروں پر ٹوپ ہوتے تھے جن میں آنکھوں کے لیے سوراخ ہوتے تھے۔ وہ اپنی ناک گندے طریقے سے اپنی پگڑیوں کے کناروں پر صاف کرتے تھے۔ انھوں نے سیاہ بیج لگائے ہوتے تھے جن پر لکھا ہوتا تھا: ''شریعت یا شہادت''۔[۵]

ان کا قائد ملا فضل اللہ تھا جو ۲۸ سالہ جوان تھا، جس کی دائیں ٹانگ بچپن کے پولیو کی وجہ سے کمزور تھی، اس لیے وہ اسے گھسیٹ کر چلتا تھا۔ فضل اللہ نے پہلا غیر قانونی ریڈیو اسٹیشن وادی سوات میں قائم کیا۔ ریڈیو ایف ایم پر فضل اللہ ہر رات ۸ سے ۱۰ بجے تک پھر صبح ۷ سے ۹ بجے تک نشریات میں اپنے آپ کو ایک اسلامی مصلح اور قرآن کے ایک شارح کے طور پر متعارف کراتا تھا۔ وہ لوگوں کو بری عادات جیسے تمباکو نوشی اور نسوار کے استعمال، ہیروئن اور چرس کے استعمال کو ترک کر دینے، داڑھیاں رکھنے اور نماز قائم کرنے کی تلقین کرتا تھا۔ اور موسیقی سننے، فلمیں دیکھنے اور رقص کرنے سے منع کرتا تھا۔ زلزلے کا سبب بھی یہی بتاتا تھا۔ مقامی اسکول کے اساتذہ اور عوام میں کچھ اُس کی تعریف اور زیادہ تر اُس کی مخالفت کرتے تھے۔ ۶ ماہ کے اندر اندر انھوں نے اسلامی نظام قائم کرنے کا اعلان کر دیا:

> ۶ ماہ کے اندر لوگ اپنے ٹی وی، ڈی وی ڈیز اور سی ڈیز سے نجات پا رہے تھے۔ فضل اللہ کے لوگ انھیں گلیوں میں بڑے بڑے ڈھیروں کی شکل میں اکٹھا کرتے اور انھیں آگ لگا دیتے جس سے گہرے سیاہ دھوئیں کے بادل اٹھتے جو آسمان کی بلندیوں تک پہنچ جاتے۔ سی ڈی اور ڈی وی ڈی کی سیکڑوں دکانیں رضاکارانہ طور پر بند کر دی گئیں اور ان کے مالکان کو طالبان کی طرف سے معاوضہ ادا کیا گیا۔ فضل

اللہ ہندوستانی فلموں سے نفرت کرتا تھا جنھیں ہم بہت پسند کرتے تھے۔ وہ انھیں غیر اسلامی کہہ کر ان کی مزمت کرتا تھا۔[۶]

فضل اللہ کی نشریات کا نشانہ اکثر خواتین ہوتی تھیں۔ اُسے معلوم تھا کہ بہت سے مرد اپنے گھروں سے دور ہیں یا جنوبی سوات میں کوئلے کی کانوں میں، یا خلیج میں تعمیراتی مقامات پر کام کر رہے تھے۔ وہ عورتوں کو اپنی گھریلو ذمہ داریوں کا احساس دلاتا اور ہنگامی حالات میں باہر نکلنے کی تلقین کرتا۔ خواتین میں ملالہ کی سہیلیاں فضل اللہ کی تعریف کرتیں اور اُس کے انداز میں باتیں کرتی تھیں۔ اس حوالے سے ملالہ لکھتی ہیں:

جیسے وہ گھوڑے پر سوار ہو اور اس نے پیغمبر ﷺ کی طرز عمل اختیار کیا ہو، عورتیں اسے اپنے خواب بتاتیں اور وہ ان کے لیے دعائیں کرتا۔ میری والدہ ان کہانیوں سے لطف اندوز ہوتیں لیکن والد خوف زدہ ہو جاتے تھے۔[۷]

چند مہینوں میں فضل اللہ نے یہ اعلان کیا کہ عورتوں کے لیے لڑکیوں کے مدرسے میں کوئی تعلیم نہیں ہونی چاہیے کیوں کہ اسلام عورتوں کے لیے کسی مدرسے سے تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس نے اسکول انتظامیہ کے خلاف لوگوں کو بھڑکانا شروع کیا اور ریڈیو پر اُن لڑکیوں کے نام لے لے کر مبارک دینی شروع کی جنھوں نے اسکول چھوڑ دیا تھا اور انھیں جنت میں جانے کی نوید بھی سنائی۔ ہر روز نیا فرمان جاری ہوتا تھا، بیوٹی پارلر بند کرنے، داڑھی مونڈنے پر پابندی عائد کر دی تھی، بازاروں میں خاص طور عید سے پہلے کے دنوں میں طالبان سے پہلے نئے لباس اور آرائش کا سامان موجود ہوتا تھا، جہاں عورتیں اور لڑکیاں چوڑیاں خریدنے اور مہندی لگوانے جاتی تھیں۔ تاہم اب خواتین کے بازار آنے اور آرائش کا سامان لینے اور دکانوں پر رکھنے پر پابندی لگا دی گئی۔ یہاں تک کہ صحت کے کارکنوں اور پولیو کے قطرے پلانے والوں کو بھی پابندی کا سامنا کرنا پڑا:

ملاکے لوگوں نے صحت کے کارکنوں کو پولیو کے قطرے پلانے سے روک دیا، یہ کہتے ہوئے کہ "یہ ویکسین مسلمان خواتین کو بانجھ بنانے کی ایک امریکی سازش ہے، کسی بیماری کے حملے سے پہلے اس کا علاج کرنا شرعی قانون کے مطابق نہیں

ہے۔" فضل اللہ نے ریڈیو پر کہا۔ "آپ سوات میں کہیں بھی کسی ایک بچے کو ویکسین کا قطرہ پیتے ہوئے نہیں دیکھیں گے"۔[۸]

طالبان نے وادی سوات کی تہذیب و ثقافت پر قبضہ کیا۔ اُس کے رقص، موسیقی کے بعد بدھا اور اُس کی تاریخ کو بھی مسخ کر دیا۔ انھوں نے بدھا کے وہ مجسمے تباہ کر دیے جو ہزاروں سال سے وہاں موجود تھے اور کشان بادشاہوں کے دور سے سوات کی تاریخ کا حصہ تھے۔ طالبان کا کہنا تھا کہ کسی بھی قسم کے مجسمے اور تصاویر حرام ہیں۔ وہ موجبِ گناہ ہیں، اس لیے ممنوع ہیں:

> انھوں نے بدھا کے چہرے کو مسخ کر دیا، جو ساتویں صدی سے لے کر اب تک وادی کی قدیم تہذیبی اور تاریخی آثار کی نگہبانی کر رہا تھا۔ طالبان فنونِ لطیفہ، تہذیب اور تاریخ کے دشمن بن گئے۔ سوات عجائب گھر نے اپنے جمع شدہ نوادرات کو محفوظ کرنے کے لیے وہاں سے ہٹا دیا۔ طالبان نے ہر پرانی چیز کو تباہ کر دیا اور خود کوئی نئی چیز نہ لا سکے۔[۹]

اسی دور میں جب طالبان سوات میں ابھر رہے تھے، اسلام آباد میں لال مسجد کے مدرسہ کی لڑکیوں نے اسلام آباد کی گلیوں میں رہنے والے لوگوں کو اسی طرز پر خوف زدہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اُن گھروں پر حملہ کرتیں جن کے بارے میں یہ دعویٰ تھا کہ وہ مساج کے مراکز ہیں۔ وہ خواتین کو اغوا کر لیتیں جن کے بارے میں وہ سمجھتی تھیں کہ وہ طوائفیں ہیں۔ مدرسہ کے نگران عبدالعزیز کی بیوی اُم حسان اس بات پر فخر محسوس کرتی تھیں کہ انھوں نے بہت سی لڑکیوں کو خود کش بمبار بننے کی تربیت دی ہے۔ پرویز مشرف کی حکومت ان حالات میں مخمصے میں تھی کہ ان لوگوں کے خلاف کارروائی کرنے کی صورت میں عوام کا کثیر حصہ (جو ایسے عناصر سے ہمدردی رکھتا تھا) کو اپنے خلاف نہ کر بیٹھیں۔ ۲۰۰۷ء کے وسط میں صورتِ حال اتنی خراب ہو چکی تھی کہ لوگوں نے فکر مند ہونا شروع کر دیا کہ عسکریت پسند دارالحکومت پر قبضہ کر لیں گے۔ بالآخر ۳ جولائی ۲۰۰۷ء کو فوجی کمانڈوز نے ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں سے مسجد کا محاصرہ کر لیا۔ لال مسجد کے محاصرے کے بعد ۱۲ جولائی ۲۰۰۷ء کو ملا فضل اللہ نے لال مسجد کے حملے کا بدلہ لینے کی بات کرتے ہوئے حکومتِ پاکستان کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا:

> یہ حقیقی مصیبت کا آغاز تھا، فضل اللہ نے اپنی دھمکیوں کو پورا کیا اور لال مسجد کے نام پر اپنے طالبان کے لیے حمایت کو متحرک کیا۔ چند دن بعد انھوں نے ایک فوجی قافلے پر جو سوات کی طرف جا رہا تھا، حملہ کیا۔ اس میں تیرہ سپاہی جاں بحق ہو گئے۔ اس کا ردِ عمل صرف سوات میں نہیں ہوا، باجوڑ میں قبائلی لوگوں کی طرف سے ایک زبردست احتجاج کیا گیا اور پورے ملک میں خود کش بمباریوں کی ایک لہر شروع ہو گئی۔[۱۰]

اُمید کی ایک کرن بے نظیر بھٹو تھیں، جو ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۷ء کو پاکستان واپس آ گئیں۔ تاہم اُمید کی یہ کرن بھی ۲۷ دسمبر ۲۰۰۷ء کو بجھا دی گئی۔ اس حادثے کے بعد فوج اپنی جیپوں، ٹینکوں اور ہیلی کاپٹروں کے ساتھ وادی سوات میں داخل ہوئی۔ مشرف نے طالبان کا مقابلہ کرنے کے لیے ۳ ہزار فوجی وادیٔ سوات میں بھیجے، دنوں اور مہینوں میں کئی خود کش بمباروں نے سوات میں فوجیوں اور عام سپاہیوں کو شہید کیا۔ اسکول بند ہو گئے اور کرفیو کئی کئی ہفتوں تک سوات کی پُر امن ریاست میں رہتا تھا۔ فضل اللہ کے گروپ کے علاوہ شمال مغربی پاکستان میں مختلف عسکریت پسند گروپ بھی سامنے آئے جو بالآخر جنوبی وزیرستان میں اکٹھے ہو کر تحریکِ طالبان پاکستان (ٹی ٹی پی) کے نام سے ایک محاذ بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ ان میں چالیس ہزار جنگجو موجود تھے جنھوں نے بیت اللہ محسود کو اپنا لیڈر مقرر کیا۔ مشرف حکومت نے بے نظیر کی موت کا الزام بیت اللہ محسود پر لگایا، جس کی ذمہ داری قبول کرنے سے بیت اللہ محسود نے انکار کیا:

> ہماری فوج اور آئی ایس آئی بہت طاقت وَر ہیں اور زیادہ تر لوگ ان چیزوں کے بارے میں سر عام آواز اٹھانا پسند نہیں کرتے تھے لیکن میرے والد اور ان کے بہت سے دوست خوف زدہ تھے۔ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں وہ ہمارے لوگوں اور پاکستان کے خلاف ہے۔ وہ کہا کرتے۔ طالبانائزیشن کی سرپرستی نہ کرو، یہ غیر انسانی ہے۔ ہمیں یہ کہا جاتا ہے کہ سوات کو پاکستان کی خاطر قربان کیا جا رہا ہے لیکن کسی بھی شہری کو ریاست کے لیے قربان نہیں کیا جانا چاہیے۔ ایک ریاست ماں کی طرح ہوتی ہے اور ماں اپنے بچوں کو علیحدہ کرتی ہے اور انھیں دھوکا دیتی ہے۔"

بی بی سی ریڈیو پشاور کے نمائندہ عبدالحئ کاکڑ کی فرمائش پر سوات میں ہونے والے مسائل کا انسانی

رُخ دکھانے کے لیے ملالہ یوسف زئی نے اپنے والد کے کہنے پر انٹرویو دیا جو اُردو بلاگ میں شائع ہوتا رہا۔ عبدالحئی کاکڑ نے ملالہ کا اصل نام چھپانے کے لیے گل مکئی کا قلمی نام دیا جو ایک پشتون لوک کہانی میں ہیروئن کا نام ہے۔ بعد میں یہ انٹرویوز گل مکئی کی ڈائری کے عنوان سے شائع ہوئے۔ جس نے دنیا بھر کی توجہ حاصل کی، اخباروں نے اقتباسات شائع کیے، اس دوران میں طالبان نے لڑکیوں کے تمام اسکول بند کر دیے تھے۔ فوج اس حوالے سے کچھ بھی نہیں کر پا رہی تھی۔ بالآخر ۵ مئی ۲۰۰۹ء کو انھیں آئی ڈی پیز بنا دیا گیا۔ اور وہ وادی سوات سے جبری ہجرت کر کے پشاور میں مقیم ہو گئے۔

کتاب کا تیسرا حصہ "تین لڑکیاں تین گولیاں" کے عنوان سے ہے، جس کے مندرجات میں "دکھوں کی وادی، قد بڑھانے کے لیے دعا، عورت اور سمندر، نجی طالبان سازی، ملالہ کون ہے؟" شامل ہیں۔ ۲۴ جولائی ۲۰۰۹ء کو وزیرِ اعظم پاکستان نے یہ اعلان کیا کہ طالبان کا وادی سوات سے صفایا کر دیا گیا ہے، گیس کی رسد بحال کر دی گئی ہے، بینک کھل رہے ہیں اور تمام لوگوں کو سوات واپس جانے کا حکم دیا گیا:

> ہمارے اسکول کی گھنٹی دوبارہ پہلی مرتبہ یکم اگست کو بجی۔ اس کی آواز سننا اور دروازے کی راہداری اور سیڑھیوں کے اوپر آنا جانا جیسا کہ ہماری عادت تھی، بہت پُر لطف تھا۔ میں اپنی تمام پرانی سہیلیوں کو دیکھ کر خوشی سے پھولی نہیں سماتی تھی۔ ہمارے آئی ڈی پیز کے عرصے سے لے کر اب تک ہمارے پاس بہت سی کہانیاں تھیں۔ ہم میں سے زیادہ تر اپنے دوستوں یا کسی خاندان کے ساتھ رہے تھے لیکن کچھ کیمپوں میں بھی رہے تھے۔ ہم جانتے تھے کہ ہم خوش قسمت تھے، بہت سے بچوں کو اپنی کلاسیں خیموں میں پڑھنی پڑتی تھیں کیوں کہ طالبان نے اسکول تباہ کر دیے تھے اور میری ایک سہیلی سندس کے والد ایک دھماکے میں جان سے چلے گئے تھے۔[۱۲]

اکتوبر ۲۰۱۱ء میں ملالہ کے والد کو ایک ای میل موصول ہوئی جس میں ملالہ کا نام ان پانچ بچوں میں شامل تھا جنھیں بچوں کے حقوق (Kids Rights) کے بین الاقوامی امن انعام کے لیے نامزد کیا گیا تھا۔ یہ ادارہ بچوں کی وکالت کا گروپ تھا، جس کا مرکز ایمسٹرڈیم میں ہے۔ ملالہ کا نام اس انعام کے لیے خپل کور فاؤنڈیشن سوات نے تجویز کیا تھا۔ اس انعام کے بعد پنجاب کے وزیر اعلیٰ شہباز شریف نے بھی ملالہ یوسف زئی کو تعلیمی میلے میں تقریر کرنے، طلباء میں مفت لیپ ٹاپ تقسیم کرنے کی دعوت دی اور حکومتِ پاکستان

کی طرف سے پہلا قومی امن انعام دیا گیا۔ لڑکیوں کے حقوق کی مہم کے سلسلے میں پانچ لاکھ روپے کا چیک بھی دیا گیا:

> جب وزیر اعظم نے مجھے انعام اور چیک دیا تو میں نے انھیں مطالبات کی ایک لمبی فہرست پیش کر دی۔ میں نے انھیں بتایا کہ ہم چاہتے ہیں کہ سوات میں ہمارے اسکولوں کی تعمیر نو کی جائے اور ایک لڑکیوں کی یونیورسٹی قائم کی جائے۔ میں جانتی تھی کہ وہ ہمارے مطالبات کو سنجیدگی سے نہیں لیں گے، لہٰذا میں نے بہت زیادہ زور نہ دیا۔ میں نے سوچا کہ ایک دن میں ایک سیاستدان بنوں گی اور یہ کام خود کروں گی۔ [۱۳]

حصہ چہارم "زندگی اور موت کے درمیان" میں ملالہ یوسف زئی پر طالبان کی طرف سے جان لیوا حملے کی روداد ہے، جسے اے خدا میں اُسے تیرے حوالے کرتی ہوں، اور نامعلوم کی جانب سفر میں بیان کیا گیا ہے۔ ۱۸ اکتوبر ۲۰۱۲ء کو ملالہ یوسف زئی کی سکول وین پر دو لڑکوں نے اُس وقت حملہ کیا جب وہ اسکول سے اپنا سالانہ پرچہ دینے کے بعد واپس گھر آ رہے تھے۔

آپ بیتی کا یہ حصہ ملالہ یوسف زئی کے صحت یاب ہونے کے بعد ان یادداشتوں پر مشتمل ہے جو اُن کے والدین اور دوستوں کے بیانات سے تحریر کیا گیا ہے۔ ملالہ جب زندگی اور موت کی کش مکش میں مبتلا تھی، اس حملے کی ذمہ داری طالبان نے قبول کی لیکن انھوں نے اس بات سے انکار کیا کہ انھوں نے یہ حملہ ملالہ کی تعلیم کی مہم کی وجہ سے کیا ہے۔ حملے کی وجوہات میں ملالہ کو سیکولرازم کا پرچار کرنے میں اُس کی قائدانہ کردار تھا۔ جب کہ طالبان کے ایک اور ترجمان کے مطابق اس حملے کا حکم فضل اللہ نے دو ماہ قبل ایک اجلاس میں دیا تھا:

> کوئی بھی شخص جو ہمارے خلاف حکومت کا ساتھ دے گا، ہمارے ہاتھوں مارا جائے گا۔ اس نے کہا تھا، آپ دیکھیں گے، دوسرے اہم لوگ بھی جلد ہی ہمارا شکار ہوں گے۔ اس نے مزید کہا کہ انھوں نے دو مقامی سواتی آدمیوں کو استعمال کیا تھا، جنھوں نے میرے بارے میں اور میرے اسکول کے راستے کے بارے میں معلومات اکٹھی کی تھیں۔ انھوں نے دانستہ طور پر آرمی چیک پوائنٹ کے قریب

حملہ کیا تھا تاکہ وہ دکھا سکیں کہ وہ کہیں بھی حملہ آور ہو سکتے ہیں۔[۱۴]

حصہ پنجم "دوسری زندگی" کے عنوان سے ہے جس میں ملالہ کے برمنگھم پہنچنے اور علاج کے بعد ہوش میں آنے کی روداد ہے، جو انھوں نے ایک نرس کے نوٹ بک اور پنسل دیے جانے پر تحریر کی ہے۔ ملالہ کی اس جدوجہد نے اُسے عالمی شہرت اور پہچان دی۔ یو این او کے خصوصی سفیر اور برطانیہ کے سابق وزیر اعظم گورڈن براؤن نے "آئی ایم ملالہ" کے عنوان کے تحت ایک پٹیشن تیار کی جس میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ ۲۰۱۵ء تک کسی بچے کو سکول سے محروم نہ رکھا جائے۔

آپ بیتی کا اختتام "ایک بچہ، ایک استاد، ایک کتاب، ایک قلم" کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔ جس میں ملالہ یوسف زئی نے وادی سوات میں اپنے بچپن، سکول کے ان دنوں کو یاد کیا ہے اور اُس کا موازنہ برمنگھم اور اُس کے اسکول سے کیا ہے جہاں کامیاب علاج ہونے کے بعد انھیں داخلہ دیا گیا تھا۔

> میری دنیا بہت زیادہ بدل چکی ہے۔ ہمارے کرایے کے رہائشی کمرے کی الماریوں میں دنیا بھر خصوصاً امریکہ، ہندوستان، فرانس، سپین، اٹلی، آسٹریا اور بہت سی دوسری جگہوں سے آئے ہوئے انعامات پڑے ہیں۔ مجھے نوبیل امن انعام کے لیے بھی نامزد کیا گیا ہے جو کہ آج تک کی کم عمر ترین فرد ہوں۔ جب مجھے اسکول میں میرے کام کے لیے انعامات ملتے تھے تو میں خوش ہوتی تھی کیوں کہ میں نے ان کے لیے کام کیا ہوتا تھا۔[۱۵]

آپ بیتی کے آخر میں پاکستان اور سوات میں اہم واقعات کو تاریخی تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ ملالہ یوسف زئی کی طرف سے پاکستان کے صدر آصف علی زرداری، یو اے ای کے ولی عہد شہزادہ محمد بن زاہد جنھوں نے برطانیہ کے سفر کے لیے ائیر ایمبولینس فراہم کی تھی، جنرل کیانی، کرنل جنید، اپنے تمام اساتذہ، کوئین ایلزبتھ ہسپتال برمنگھم کے عملے اور معاون کتاب کرسٹینا لینن کا خصوصی شکریہ ادا کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ملالہ فنڈ کے قیام اور عطیے کے لیے انجلینا جولی کا بھی خصوصی شکریہ ادا کیا گیا ہے۔ آپ بیتی کے آخر میں ملالہ فنڈ پر نوٹ اور ایڈیٹر جوڈی کلائن کی طرف سے ملالہ یوسف زئی کے درمیان گفتگو کو بھی شاملِ آپ بیتی کیا گیا ہے۔

ملالہ یوسف زئی کی یہ آپ بیتی وادی سوات کی تہذیبی، ثقافتی اور سماجی تاریخ کے ساتھ ساتھ

طالبان کی سفاکیت کا براہِ راست ریکارڈ ہے۔ ریاستی کمزوری، مقامی سیاست اور فوجی آپریشن کے دوران انسانی المیوں کا بیان ہے۔ یہ آپ بیتی جنوبی ایشیا میں لڑکیوں کی تعلیم کا عالمی مقدمہ پیش کرتی ہے۔ آپ بیتی کی نثر، سادہ بیانی جذباتی تاثر سے بھرپور ہے، اور ہر باب کے ابتدا میں مقامی شعراء کی مثالیں ملتی ہیں۔ بالخصوص جب وہ اپنے والد، سوات یا تعلیم کے خواب کا ذکر کرتی ہیں۔ یہ آپ بیتی سیاسی بیانیے کی نمائندہ مثال ہے۔ اس آپ بیتی کا متن عسکریت پسندی کے مطالعے، سوشل کنفلیکٹ تھیوری اور ریڈیکلائزیشن اسٹڈیز کے محققین کے لیے اہم ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ملالہ یوسف زئی، کرسٹینا لیمب، میں ہوں ملالہ، مترجمہ: مقبول الٰہی (لاہور: مشعل بکس، ۲۰۱۷ء)، ۹۔
۲۔ ایضاً، ۱۹۔
۳۔ ایضاً، ۳۹۔
۴۔ ایضاً، ۶۳۔
۵۔ ایضاً، ۱۰۹۔
۶۔ ایضاً، ۱۲۷۔
۷۔ ایضاً، ۱۵۹۔
۸۔ ایضاً، ۱۶۵۔
۹۔ ایضاً، ۱۸۵۔
۱۰۔ ایضاً، ۱۹۷۔
۱۱۔ ایضاً، ۲۳۱۔
۱۲۔ ایضاً، ۲۴۷۔
۱۳۔ ایضاً، ۲۶۱۔
۱۴۔ ایضاً، ۲۸۱۔
۱۵۔ ایضاً، ۲۹۱۔